عمر بن عبد العزیز

عمر بن عبد العزیز (۱۰۱ - ۶۲ھ) بنو امیہ کے امرا میں سے تھے۔ ان کی ابتدائی زندگی تعیش کی زندگی تھی۔ ان کی رئیسانہ چال اتنی مشہور ہوئی کہ اس کو عمری چال (المشیۃ العمریۃ) کہا جانے لگا۔

۹۹ھ میں سلیمان بن عبد الملک اموی کی وفات ہوئی۔ اس کی وصیت کے مطابق حضرت عمر بن عبد العزیز خلیفہ مقرر ہوئے۔ وہ اگرچہ بظاہر عیش و عشرت کے ساتھ رہتے تھے۔ مگر ان کے سینہ میں ایک دردمندانہ دل تھا۔ چنانچہ خلافت کے عہدہ پر تقرر کے بعد ان کی زندگی بالکل بدل گئی۔ ذمہ داری کے احساس نے ان سے دنیوی لذت و آرام کا احساس چھین لیا۔ ان کے ایک ساتھی ان کے بارے میں کہتے ہیں:

رأیتہ فی المدینۃ وھو أحسن الناس ملبسًا ومن أطیب الناس ریحًا ومن اخیل الناس فی مشیتہ۔ ثم رایتہ بعد ذالک یمشی مشیۃ الرھبان۔

میں نے ان کو مدینہ میں دیکھا اور وہ سب سے بہتر لباس میں تھے۔ اور سب سے اچھی خوشبو لگائے ہوئے تھے۔ اور سب سے زیادہ امیرانہ چال چلتے تھے۔ پھر میں نے ان کو اس کے بعد دیکھا کہ وہ درویش کی چال چل رہے تھے۔

عمر بن عبد العزیز علم میں اتنے بڑھے ہوئے تھے کہ ان کی بابت ایک معاصر عالم نے کہا: ما کان العلماءُ عند عمر بن عبد العزیز الا تلامیذ (عمر بن عبد العزیز کے سامنے علماء محض شاگرد معلوم ہوتے تھے)

عمر بن عبد العزیز سے پہلے بنو امیہ کے خلفاء نہایت شان و شوکت کے ساتھ رہتے تھے، مگر انھوں نے اس قسم کی تمام چیزوں کو چھوڑ دیا۔ خلافت کے عہدہ پر فائز ہونے کے بعد ان کے سامنے شاہانہ سواری لائی گئی جو نہایت شاندار اور مزین تھی، مگر انھوں نے اس کو قبول نہیں کیا۔ انھوں نے کہا کہ میرا جانور میرے لیے زیادہ ٹھیک ہے (دابتی اوفق لی)

حضرت عمر بن عبد العزیز شوریٰ کے اصول پر نہایت شدت کے ساتھ قائم تھے۔ خلافت

کے عہدہ پر ان کا تقرر سابق خلیفہ کی وصیت کے تحت ہوا تھا۔ مگر انھوں نے اس کو کافی نہیں سمجھا۔ اس سلسلہ میں تاریخ کا بیان ہے :

وجمع الناس فی المسجد، وکان من قوله لهم : إنّی قد خلعتُ ما فی أعناقکم من بیْعتی، فاختاروا لأنفسکم۔ فصاح الناس صیحةً واحدة : قد اخترناك یا امیر المومنین ۔

عمر بن عبد العزیز نے تقرری کے بعد لوگوں کو دمشق کی جامع مسجد میں جمع کیا۔ انھوں نے لوگوں سے کہا کہ میری بیعت کا قلادہ جو تمہاری گردن میں تھا اس کو میں نے اتار دیا۔ پس تم خود اپنے لیے کسی کو پسند کر کے خلیفہ بنالو۔ یہ سن کر تمام لوگ ایک آواز چیخ اٹھے : اے امیر المومنین ہم آپ ہی کو منتخب کرتے ہیں۔

سابق خلیفہ سلیمان بن عبد الملک کے انتقال کے بعد لوگ مسجد میں جمع کیے گئے۔ رَجاء بن حَیوہ نے سلیمان بن عبد الملک کا وہ وصیت نامہ پڑھ کر سنایا جس میں عمر بن عبد العزیز کو خلیفہ نامزد کیا گیا تھا۔ حضرت عمر بن عبد العزیز کا حال اس وقت یہ تھا کہ وہ خلافت کے لیے اپنا نام سن کر إنا للہ وانا الیہ راجعون پڑھ رہے تھے۔ اس تحریر کو سن کر وہ اپنی جگہ پر بیٹھے رہ گئے۔ ایک شخص نے ہاتھ پکڑ کر انھیں اٹھایا اور لے جا کر منبر پر بٹھایا۔ اس کے بعد خلافت کی بیعت ہوئی۔ جب آپ بیعت سے فارغ ہو کر گھر واپس آئے تو آپ کی داڑھی آنسوؤں سے تر تھی۔

خلافت کے بعد آپ کی خدمت میں سواری کے لیے شاہی گھوڑے پیش کیے گئے تو آپ نے فرمایا : میرا جانور میرے لیے زیادہ بہتر ہے (دابتی اوفق لی) اسی طرح آپ سے کہا گیا کہ شاہی محل میں قیام کریں۔ آپ نے فرمایا کہ میرا خیمہ میرے لیے کافی ہے (فی فسطاطی کفایة)

سلیمان بن عبد الملک کا ایک بھتیجا عبد العزیز بن ولید بن عبد الملک تھا۔ سلیمان بن عبد الملک کی وفات کے وقت وہ دار الخلافہ سے باہر تھا۔ اس کو عمر بن عبد العزیز کی بیعت کا حال معلوم نہ ہو سکا تھا۔ چنانچہ اس نے سلیمان کی وفات کی خبر سن کر خلافت کا دعوی کر دیا اور اپنی فوج لے کر دمشق کی طرف روانہ ہو گیا۔ جب وہ دمشق پہنچا اور اس کو معلوم ہوا کہ عمر بن عبد العزیز کے

خشیتِ خداوندی (فاطر ۲۸) سے پیدا ہوتا ہے۔ کتابی علم کی ایک حد ہے، مگر خشیت کے ذریعہ ملنے والے علم کی کوئی حد نہیں۔

حضرت عمر بن عبد العزیز کا دینی مقام اتنا بلند ہے کہ وہ عمر ثانی کہے جاتے ہیں۔ ان کے مخالفین تک ان کی عظمت اور پاکبازی کا اعتراف کرتے تھے۔ انسائیکلو پیڈیا برٹانیکا (۱۹۸۴) کے مقالہ نگار نے لکھا ہے کہ بنو امیہ میں وہ واحد شخص تھے جن کا احترام بعد کو آنے والے بنو عباس کرتے تھے، حتی کہ وہ شیعوں کے درمیان بھی انتہائی محترم سمجھے جاتے تھے جو دوسرے مسلمانوں سے الگ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے داماد علی کی پیروی کرتے ہیں:

He, alone of the Umayyads, was respected by the later Abbasid dynasty, and was highly regarded even among the Shi'ites, schismatic followers of Muhammad's son-in-law Ali (X/248).

جراح بن عبد اللہ اسلمی خراسان کے عامل (گورنر) تھے۔ حضرت عمر بن عبد العزیز کے پاس شکایت پہنچی کہ اہل ذمہ میں سے جو لوگ اسلام قبول کر لیتے ہیں، جراح بن عبد اللہ ان سے بھی جزیہ وصول کرتے ہیں۔ آپ نے فوراً جراح بن عبد اللہ کے پاس یہ حکم بھیجا کہ جو شخص نماز پڑھتا ہو اس کا جزیہ معاف کر دیا جائے۔ اس خبر کو سننے کے بعد لوگ کثرت سے اسلام میں داخل ہونے لگے۔

جراح بن عبد اللہ نے حضرت عمر بن عبد العزیز سے کہا کہ اگر ایسی پالیسی اختیار کی گئی تو ہماری آمدنی بہت کم ہو جائے گی اور حکومت کو سخت مالی نقصان ہوگا۔ آپ نے فرمایا: تمہارا برا ہو، محمدؐ ہدایت کے لیے بھیجے گئے تھے نہ کہ مال گزاری وصول کرنے کے لیے (ویحك إنّ محمّداً بُعث هادياً ولم يُبعث جابياً)

زندہ یا مردہ

گاڑی کے چلنے کی دو صورتیں ہیں۔ ایک یہ کہ اس کو ایک ڈرائیور چلائے۔ اور دوسری صورت یہ ہے کہ اس کے انجن کو چلا کر اس کو سڑک پر چھوڑ دیا جائے۔ بظاہر دونوں گاڑی چلتی ہوئی نظر آئے گی۔ مگر دونوں میں بہت بڑا فرق ہے۔ ڈرائیور والی گاڑی چل کر اپنی منزل پر پہنچتی ہے۔ مگر بے ڈرائیور گاڑی کا انجام صرف یہ ہے کہ وہ کچھ دیر تک دوڑے اور اس کے بعد کسی چیز سے ٹکرا کر ختم ہو جائے۔

ایک باہوش ڈرائیور جب گاڑی کو چلاتا ہے تو وہ راستہ کو دیکھتا ہوا گاڑی چلاتا ہے۔ ضرورت کے مطابق وہ کبھی چلتا ہے اور کبھی رک جاتا ہے۔ کبھی آگے بڑھتا ہے اور کبھی پیچھے ہٹ جاتا ہے۔ کبھی سیدھے چلتا ہے اور کبھی دائیں یا بائیں کی طرف مڑ جاتا ہے۔ یہی وہ گاڑی ہے جو کامیابی کے ساتھ اپنی منزل پر پہنچتی ہے۔

اس کے برعکس جو گاڑی ڈرائیور کے بغیر دوڑ رہی ہو وہ بس یک طرفہ طور پر دوڑتی رہے گی۔ اس گاڑی کے ساتھ عقل اور شعور شامل نہیں۔ وہ نہ رکے گی اور نہ پیچھے ہٹے گی۔ وہ نہ کہیں مڑے گی اور نہ کبھی سست ہوگی۔ وہ اندھا دھند بس آگے کی طرف دوڑتی رہے گی۔ ایسی گاڑی کا واحد انجام یہ ہے کہ وہ تھوڑی دور چلے اور اس کے بعد ٹکرا کر اپنا خاتمہ کرلے۔

اس مثال سے زندہ انسان اور مردہ انسان کا فرق معلوم ہوتا ہے۔ زندہ انسان باہوش انسان ہے اور مردہ انسان بے ہوش اور بے عقل انسان۔ زندہ انسان اگر کسی وقت بولے گا تو حسب موقع چپ بھی ہو جائے گا۔ وہ اگر چلے گا تو کبھی رک بھی جائے گا۔ وہ اگر آگے بڑھے گا تو حالات کو دیکھ کر پیچھے بھی ہٹ جائے گا۔ وہ اگر تیز دوڑے گا تو کبھی اپنی رفتار سست بھی کرے گا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ وہ اپنی کامیابی تک پہنچ جائے گا —— اس کے برعکس مردہ انسان وہ ہے جو اس قسم کی سمجھ سے خالی ہو۔ جو بولنے کے بعد چپ نہ ہو سکے۔ جو چلنے کے بعد رکنا نہ جانے۔ جو صرف اپنی شرطوں کو منوانا جانتا ہو۔ فریق مخالف کی شرطوں پر راضی ہونا اس کے یہاں خارج از بحث ہو۔ ایسا انسان مردہ انسان ہے۔ خدا کی دنیا میں اس کے لیے صرف یہ مقدر ہے کہ وہ تباہی اور بربادی کا نشان بن کر رہ جائے۔

قرآنی نظریہ سزا کا اعتراف

ٹائمس آف انڈیا (۳۰ جون ۱۹۸۷) نے امریکی خبر رساں ایجنسی اے ایف پی کے حوالہ سے ایک خبر شائع کی ہے۔ اس کے مطابق ٹکساس کے اٹارنی جنرل جم میڈاکس نے اپیل کی ہے کہ ان کی ریاست میں سزائے موت کے واقعات کو فلمایا جائے تاکہ عوام دیکھیں کہ کس طرح ایک مجرم کو موت کی سزا دی گئی ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ موت کی (موجودہ) سزائیں معمول کی چیز بن گئی ہیں۔ انھوں نے اپنی مانع جرم حیثیت کھو دی ہے۔ ریاست ٹکساس نے ۱۹۸۲ سے اب تک ۲۸ قیدیوں کو سزائے موت دی ہے۔ یہ سب سزائیں مہلک انجکشن کے ذریعہ دی گئیں۔ سزائے موت کا یہ سلسلہ امریکی سپریم کورٹ کے ایک فیصلہ کے بعد شروع ہوا ہے جس میں کہا گیا تھا کہ ریاستوں کو چاہیے کہ وہ موت کی سزا کو دوبارہ شروع کریں۔ اس سے پہلے امریکہ میں سزائے موت کو یہ کہہ کر بند کر دیا گیا تھا کہ وہ سزا کا بے رحمانہ طریقہ ہے:

FILMING EXECUTIONS: Texas Attorney General Jim Maddox is calling for executions in his state to be filmed so the public can see how a criminal is put to death, reports AFP from Huntsville, Texas. He says executions have become so routine that their deterrent purpose is being lost. Texas has executed 28 prisoners — all by lethal injection — since 1982, after a supreme court ruling allowing states to reintroduce capital punishment, earlier banned as a 'cruel and unusual punishment' (p. 7).

امریکہ میں سزائے موت کو بے رحمانہ قرار دے کر اسے بند کر دیا گیا تھا۔ مگر اس کے بعد جرائم میں بہت زیادہ اضافہ ہو گیا۔ چنانچہ ۱۹۸۲ میں سپریم کورٹ کے فیصلہ کے تحت اسے دوبارہ کھولا گیا۔ تاہم اب بھی مجرم کو موت کی سزا دینے کا جو طریقہ اختیار کیا گیا وہ یہ تھا کہ اسے بے ہوش کر کے مہلک انجکشن دیا جائے۔ اور پھر خاموشی سے اس کو دفن کر دیا جائے۔

ایسی حالت میں سزائے موت صرف ایک خبر تھی نہ کہ عوامی سبق۔ اب امریکہ کے مدبرین کو احساس ہوا کہ سزائے موت کو عوامی مشاہدہ میں بھی آنا چاہیے تاکہ وہ دوسروں کو جرم سے روکنے کا سبب بن سکے۔ حتی کہ وہ چاہتے ہیں کہ سزائے موت کے عمل کو فلم پر ریکارڈ کیا جائے اور اس کو ٹیلی وزن پر دکھا کر تمام لوگوں کے لیے عبرت کا سامان بنا دیا جائے۔

ہر ایک کی کہانی

فیجی ایک چھوٹا سا ملک ہے جو بحر الکاہل کے جنوبی حصہ میں واقع ہے۔ ۱۹۷۰ میں وہ برطانی قبضہ سے آزاد ہوا۔ اس کی راجدھانی سوا (Suva) ہے۔ یہاں تقریباً ۵۰ فی صد ہندستانی نسل کے لوگ ہیں جو کہ برطانی قبضہ کے دور میں ہندستان سے جاکر وہاں آباد ہوئے۔

۱۱ اپریل ۱۹۸۷ کو فیجی میں الکشن ہوا۔ اس الکشن کے نتیجہ میں وہاں نئی حکومت بنی۔ اس حکومت کے وزیر اعظم تموکی باودرا (Timoci Bavadra) تھے۔ نئی حکومت میں چوں کہ ہندستانی نسل کے لوگوں کا غلبہ تھا، فیجی نسل کے لوگوں نے اس کے خلاف مظاہرے کیے۔ انھوں نے اس کو فیجی میں چھوٹا ہندستان (Little India) قائم کرنے کا نام دیا۔ اس کے جواب میں وزیر اعظم باودرا نے نہایت پر اعتماد بیان دیا۔ انھوں نے کہا:

I am in control. I will remain in control.

معاملات پوری طرح میرے قبضہ میں ہیں اور وہ بدستور میرے قبضہ میں رہیں گے (ٹائمس آف انڈیا ۱۵ مئی ۱۹۸۷) مگر اس اعلان کے صرف چند دن بعد ۱۴ مئی ۱۹۸۷ کو فیجی میں فوجی انقلاب آگیا۔ ۳۸ سالہ لفٹننٹ کرنل رابوکا (Sitiveni Rabuka) دس مسلح فوجیوں کے ساتھ پارلیمنٹ ہاؤس میں داخل ہوئے اور منتخب وزیر اعظم کو ان کے ۲۷ ساتھیوں سمیت گرفتار کرلیا اور ایک ٹرک پر بٹھا کر نامعلوم منزل کی طرف روانہ کردیا۔ کرنل رابوکا نے ۱۷ سالہ دستور کو معطل کردیا اور خود اپنے بنائے ہوئے دستور کے مطابق فیجی پر اپنی حکومت کا اعلان کردیا۔

وزیر اعظم تموکی باودرا کی کہانی ہر انسان کی کہانی ہے۔ جس آدمی کو بھی یہاں کچھ مواقع ملتے ہیں وہ سمجھ لیتا ہے کہ سب کچھ میرے قبضہ میں ہے، کوئی مجھے بے دخل کرنے والا نہیں۔ مگر جلد ہی خدا کا قانون ظاہر ہوتا ہے اور وہ تنکے کی طرح نکال کر پھینک دیا جاتا ہے۔ یہ واقعہ اس دنیا میں ہر روز ہو رہا ہے۔ مگر ہر آدمی اس کو صرف اخبار کی خبر سمجھتا ہے، کوئی نہیں جو اس کو اپنی زندگی کی خبر سمجھے۔

الرسالہ جنوری ۱۹۸۸

ISSN 0970-180X

الرسالہ

زیر سرپرستی
مولانا وحید الدین خان
صدر اسلامی مرکز

اجتماعی زندگی میں سب سے کم اہم لفظ میں ہے
اور سب سے زیادہ اہم لفظ آپ

شمارہ ۱۳۴
جنوری ۱۹۸۸

بسم اللہ الرحمن الرحیم

اردو، انگریزی میں شائع ہونے والا

الرسالہ

اسلامی مرکز کا ترجمان

شمارہ ۱۳۴ جنوری ۱۹۸۸

فہرست

عمر بن عبد العزیز	صفحہ ۲	سب سے بڑی بھول	صفحہ ۱۵
زندہ یا مردہ	۶	دنیا اور آخرت	۱۶
قرآنی نظریہ کا اعتراف	۷	اجنبی دین	۱۷
ہر ایک کی کہانی	۸	شیطان کی پیروی	۱۸
زندگی کا سفر	۹	جن اور عملیات	۲۰
ممکن اور ناممکن	۱۰	تشویہ حقائق	۲۵
معذوری کے باوجود	۱۱	ایک سفر	۲۹
منفی عمل	۱۲	خبرنامہ اسلامی مرکز	۴۴
ذہنیت کا فرق	۱۳	ایجنسی الرسالہ	۴۸

ماہانہ الرسالہ، سی ۲۹ نظام الدین ویسٹ، نئی دہلی ۱۱۰۰۱۳، فون : 697333, 611128

زندگی کا سفر

انسان دو قسم کے ہوتے ہیں۔ ایک وہ جن کی تربیت مصائب کی درس گاہ میں ہوتی ہے۔ اور دوسرے وہ جن کی تربیت آسانیوں کی درس گاہ میں ہوتی ہے۔ بظاہر آسانیوں میں پرورش پانا اچھی بات ہے۔ مگر وہ چیز جس کو انسان سازی کہتے ہیں، اس کی حقیقی جگہ صرف مصائب کی درسگاہ ہے نہ کہ آسانیوں کی درس گاہ۔ کسی کا یہ قول نہایت درست ہے کہ سہولت نہیں بلکہ جدوجہد، آسانی نہیں بلکہ مشکل وہ چیز ہے جو انسان کو انسان بناتی ہے:

It is not ease but effort,
not facility but difficulty
that makes men.

زندگی کے سیلاب میں بے شمار لوگ مصیبتوں کی زد میں آتے ہیں۔ مگر مشاہدہ بتاتا ہے کہ عام طور پر لوگوں کا انجام دو قسم کا ہوتا ہے۔ ایک وہ لوگ جو مصیبتوں کے مقابلہ میں ٹھہر نہیں پاتے اور مایوسی اور دل شکستگی کا شکار ہو کر رہ جاتے ہیں۔ دوسرے وہ جو مضبوط اعصاب والے ثابت ہوتے ہیں۔ وہ مصائب کا مقابلہ کرتے ہیں اور آخر کار اپنے لیے ایک زندگی بنانے میں کامیاب ہو جاتے ہیں۔

تاہم دوسرے گروہ کو یہ کامیابی ہمیشہ ایک محرومی کی قیمت پر ملتی ہے۔ مادی تجربات انھیں فکر کے اعتبار سے بھی مادی بنا دیتے ہیں۔ وہ دیکھتے ہیں کہ مادی چیزوں سے محرومی نے انھیں ماحول میں بے قیمت کر دیا تھا اور جب انھوں نے مادی چیزوں کو پالیا تو اسی ماحول میں وہ دوبارہ قیمت والے ہو گئے۔ اس تجربہ کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ وہ سراسر مادہ پرست انسان بن جاتے ہیں۔ وہ مادی چیزوں کے کھونے کو کھونا سمجھنے لگتے ہیں اور مادی چیزوں کے پانے کو پانا۔

مصیبتوں میں پڑنے کا اصل فائدہ سبق اور نصیحت ہے۔ مگر یہ فائدہ صرف اس وقت ملتا ہے جب کہ آدمی مصیبتوں کی زد میں آئے مگر وہ ہلاک نہ ہو۔ وہ زندگی کی تلخیوں سے دوچار ہو مگر وہ ان سے اوپر اٹھ کر سوچ سکے۔ مصیبتیں اور تلخیاں اس کے لیے تجربہ ثابت ہوں نہ کہ وہ اس کے ذہن کی معمار بن جائیں۔

ممکن اور ناممکن

سابق وزیر اعظم ہند لال بہادر شاستری جنوری ۱۹۶۶ میں انتقال کر گیے۔ اس کے بعد کانگریس پارٹی نے مسز اندرا گاندھی کو وزیر اعظم بنایا۔ تاہم مرارجی ڈیسائی سے ان کی کش مکش جاری رہی۔ کیوں کہ وہ خود وزیر اعظم بننا چاہتے تھے۔ ۱۹۶۷ کے الکشن کے بعد مرارجی ڈیسائی کو نائب وزیر اعظم بنایا گیا۔

مگر مرارجی ڈیسائی نائب وزیر اعظم کے عہدہ کو اپنے لیے کمتر سمجھتے تھے۔ چنانچہ کش مکش بدستور جاری رہی۔ سابق وزیر اطلاعات مسٹر اندر کمار گجرال نے لکھا ہے کہ ۱۹۶۹ میں مسز اندرا گاندھی نے ان کے ذریعہ مرارجی ڈیسائی کو یہ پیش کش کی کہ ان کو مزید اعزاز دے کر راشٹرپتی (پریسیڈنٹ) کا عہدہ دیدیا جائے۔ مسٹر گجرال کا بیان ہے کہ جب انھوں نے یہ پیش کش مرارجی ڈیسائی کے سامنے رکھی تو بلا تاخیر ان کا جواب یہ تھا:

Why not she herself?

اندرا گاندھی خود کیوں نہیں (ٹائمس آف انڈیا ۱۲ جولائی ۱۹۸۷) یعنی اندرا گاندھی خود پریسیڈنٹ بن جائیں اور مجھے وزیر اعظم بنا دیں۔ واقعات بتاتے ہیں کہ مرارجی ڈیسائی کانگریس سے الگ ہوگیے۔ انھوں نے وزیر اعظم بننے کے لیے سارے ملک کو الٹ پلٹ ڈالا۔ مارچ ۱۹۷۷ کے الکشن میں جنتا پارٹی کی جیت کے بعد وہ مختصر مدت کے لیے وزیر اعظم بن بھی گیے۔ مگر جلد ہی بعد وہ سیاسی زوال سے دوچار ہوئے اور پھر کبھی ابھر نہ سکے۔

مرارجی ڈیسائی کی سیاسی ناکامی کا اصل سبب یہ تھا کہ وہ ممکن کو چھوڑ کر ناممکن کی طرف دوڑے۔ اگر وہ اس راز کو جانتے کہ موجودہ حالات میں ان کے لیے جو آخری ممکن چیز ہے وہ صدارت ہے نہ کہ وزارتِ عظمیٰ، تو یقیناً وہ ذلت اور ناکامی سے بچ جاتے۔ مگر ناممکن کے پیچھے دوڑنے کا نتیجہ یہ ہوا کہ وہ ممکن سے بھی محروم ہو کر رہ گیے۔

ناممکن کے پیچھے دوڑنا، آدمی کو ممکن سے بھی محروم کر دیتا ہے۔ جب کہ ممکن پر قانع ہونے والا ممکن کو بھی پاتا ہے اور بالآخر ناممکن کو بھی۔

معذوری کے باوجود

میں نے ۱۹۸۲ میں اپنا پاؤں کھو دیا تھا۔ اور اسی وقت سے میں دنیا کے گرد سمندری سفر کرتا رہا ہوں۔ یہ بات ٹرسٹن جونز نے تھائی لینڈ کے معذور بچوں کے ایک گروپ سے بینکاک میں کہی۔ وہ ایک ملاح اور مصنف اور مہم جو ہیں۔ ان کا پیغام بہت واضح تھا: آپ یہ انتظار نہ کریں کہ دوسرے لوگ آپ کی مدد کریں۔ آپ کو اپنی مدد آپ کرنے کا فن سیکھنا چاہیے اور خود اپنے طریقہ پر کام کرنا چاہیے، باریش کیپٹن نے کہا۔ ۵۳ سالہ جونز ۱۹۵۲ سے اپنے طریقہ پر غیر معمولی کام کرتے رہے ہیں جب کہ وہ برطانیہ کے شاہی بحریہ سے یہ کہہ کر الگ کر دیے گئے تھے کہ وہ جسمانی طور پر سمندر کے لیے غیر موزوں ہیں۔ دوسری جنگ عظیم کے دوران فوجی ڈیوٹی کرتے ہوئے ان کے ایک پاؤں کو زخم لگا تھا۔ یہ حادثہ بالآخر انھیں معذور قرار دینے تک پہنچا اور ۱۹۸۲ میں ان کا بایاں پاؤں گھٹنے کے اوپر سے کاٹ دیا گیا۔ ۱۹۵۳ سے مسٹر جونز دنیا کے سامنے یہ ثابت کرتے رہے ہیں کہ وہ کچھ اور ہو سکتے ہیں مگر وہ جسمانی طور پر سمندر کے لیے غیر موزوں ہرگز نہیں۔ پچھلے ۳۴ سالوں میں انھوں نے ۶ لاکھ ۴۰ ہزار کیلو میٹر کا بحری سفر کیا ہے۔ انھوں نے بیس بار اٹلانٹک سمندر کو پار کیا ہے اور کرہ ارض کے گرد تین بحری سفر مکمل کیے ہیں:

"I lost my leg in 1982 and have been sailing around the world ever since," Tristan Jones — sailor, author and adventurer — told a group of handicapped Thai children in Bangkok, reports DPA. The message was clear, "You must not wait for people to help you. You must learn to help yourself and must do things your own way," the bearded Welsh captain said. Jones, 53, has been doing extraordinary things his own way since 1952 when he was discharged from Britain's Royal Navy for being "physically unfit for sea." He had received a leg wound in active duty during World War II that eventually led to his invalid status and in 1982 resulted in the amputation of his left leg, above the knee. Since 1953 Jones has been proving to the world that he is anything but "physically unfit for sea." In the past 34 years he has sailed 640,000 kms (all in craft under 40 feet), made 20 trans-Atlantic ocean crossings (nine single-handed) and circumnavigated the world three times.

The Times of India (New Delhi) August 18, 1987

منفی عمل

ایک مغربی مصنف نے کہا کہ ہر بار جب میں حقیقت کے لیے اپنا دروازہ بند کرتا ہوں تو وہ کھڑکی کے راستے سے میرے گھر کے اندر داخل ہوجاتی ہے:

Every time I close the door ón reality,
it comes in through the window.
— Ashleigh Brilliant

یہ بہت بامعنی قول ہے۔ حقیقت کی مثال سیلاب کی سی ہوتی ہے۔ اگر کوئی بند ٹوٹ جائے اور سیلاب کا دھارا آپ کے گھر کی طرف رخ کرے تو آپ اپنا دروازہ بند کرکے اس سے محفوظ نہیں رہ سکتے۔ اگر آپ نے سامنے کا دروازہ بند کیا تو وہ پیچھے کے دروازہ سے آپ کے گھر کے اندر داخل ہوجائے گا، حتی کہ اگر آپ اپنے تمام دروازے اور تمام کھڑکیاں بند کرلیں تو وہ دیوار کو توڑ کر آپ کے گھر میں گھس پڑے گا۔ اس قسم کی کوئی تدبیر سیلاب کو روکنے کا ذریعہ نہیں بن سکتی۔

موجودہ زمانہ کے مسلمان مکمل طور پر اس کے مصداق ثابت ہوئے ہیں۔ موجودہ زمانہ میں حقائق کا ایک نیا طوفان اٹھا۔ اس نے مسلمانوں کے ملی وجود کو ہر طرف سے چیلنج کرنا شروع کیا۔ مگر مسلمانوں نے اپنے "دروازوں" اور "کھڑکیوں" کو بند کرکے سمجھا کہ وہ طوفان کی زد سے محفوظ ہوگیے ہیں۔ انھوں نے غیر جانب دارانہ طور پر مسئلہ کو سمجھنے کی کوشش نہیں کی۔ وہ یہ سوچ کر مطمئن ہوگیے کہ "ہم نے" تو بحر ظلمات میں اپنے گھوڑے دوڑا دیئے ہیں اور آندھیوں سے کہہ دیا ہے کہ تم اپنا راستہ دوسری طرف تلاش کرلو۔ پھر یہ طوفان ہمارا کیا بگاڑ سکتے ہیں۔ مگر یہ خوش فہمیاں ہمارے کچھ کام نہ آئیں۔ سیلاب اس طرح ہمارے ٹھکانوں میں گھسا کہ وہ آخری متاع تک بہا لے گیا۔

مسلمانوں کے لیے تعمیر نو کا آغاز یہ ہے کہ وہ کھلے دل سے اپنے پچھڑے پن کا اعتراف کریں، جب تک وہ اس کا اعتراف نہ کریں وہ اپنی منزل کی طرف کوئی حقیقی سفر شروع نہیں کرسکتے۔

ذہنیت کا فرق

۴ نومبر ۱۹۸۷ کو لاہور میں پاکستان اور آسٹریلیا کے درمیان ریلائنس کپ کے لیے کرکٹ میچ تھا۔ اس میچ میں پاکستان کی ٹیم ہار گئی۔ یہ خبر بہت سے پاکستانیوں کے لیے اتنی سخت ثابت ہوئی کہ ان پر دل کا دورہ پڑ گیا۔ حتی کہ بعض افراد اس صدمہ کو برداشت نہ کر سکے اور حرکت قلب بند ہونے کی وجہ سے انتقال کر گئے (ٹائمس آف انڈیا ۸ نومبر ۱۹۸۷)

یہی بات ہندستان میں اس وقت پیش آئی جب کہ اگلے دن ۵ نومبر کو بمبئی میں انگلینڈ کے مقابلہ میں ہندستان کی ٹیم ہار گئی۔ ہندستان میں کسی کے حرکت قلب بند ہونے کی اطلاع تو نہیں آئی۔ البتہ ایک اور شکل میں یہاں بھی موتیں واقع ہوئیں۔ دونوں طرف کے پرستاروں کے درمیان ایک سے زیادہ مقامات پر ٹکراؤ ہو گیا۔ اور وہ ناخوش گوار چیز پیش آئی جس کو ہندستان ٹائمس (۶ نومبر ۱۹۸۷) نے بجا طور پر میچ فسادات (Match riots) کا نام دیا ہے۔

۹ نومبر کی ایک ملاقات میں اس کا ذکر مسٹر شکیل احمد خاں (پیدائش ۱۹۴۸) سے ہوا۔ انھوں نے انجینئرنگ کی تعلیم حاصل کی ہے، اور آج کل عرب امارات کی ایک فرم میں چیف انجینیر ہیں۔ انھوں نے مسکراتے ہوئے کہا کہ اس معاملہ میں میرا طریقہ بالکل الگ ہے۔ میں کبھی شکست کے احساس سے دوچار نہیں ہوتا۔ کیوں کہ جیتنے والی ٹیم کو میں اپنی ٹیم سمجھتا ہوں:

I never lose, winning team is my team.

یہی وہ چیز ہے جس کو موجودہ زمانہ میں اسپورٹس مین شپ (Sportsmanship) کہا جاتا ہے۔ باعتبار مفہوم اس کو ہنر پسندی کہہ سکتے ہیں۔ یہ صحت مند ذہن کی علامت ہے۔ اس ذہن کے مطابق اصل چیز کھیل ہے نہ کہ کھیلنے والا۔ صحیح اسپورٹسمین اسپرٹ یہ ہے کہ آدمی کی نگاہ ہنر پر ہو۔ وہ یہ دیکھے کہ کھیل کیسا کھیلا گیا، نہ یہ کہ کون شخص کھیلا۔

۱۹۴۷ کے "انقلاب" کا ایک نتیجہ یہ ہے کہ ہندستان اور پاکستان میں اس صحت مند مزاج کا خاتمہ ہو گیا ہے۔ یہاں کے لوگ ہنرمندی سے محظوظ نہیں ہو پاتے۔ وہ صرف یہ دیکھتے ہیں کہ جیتنے والا کون ہے اور ہارنے والا کون۔ اپنی قوم کا آدمی جیتے تو وہ خوشی مناتے

ہاتھ پر خلافت کی بیعت ہوئی ہے تو بلا تاخیر وہ ان کی خدمت میں حاضر ہوا اور ان کے ہاتھ پر خلافت کی بیعت کی۔

عبدالعزیز بن ولید نے کہا کہ مجھ کو آپ کی بیعت کا حال معلوم نہ تھا، ورنہ میں اپنی خلافت کا اعلان نہ کرتا۔ حضرت عمر بن عبدالعزیز نے کہا کہ اگر تم خلافت کے لیے کھڑے ہوجاتے تو میں ہرگز تمہارے مقابلہ پر نہ آتا بلکہ اس سے الگ ہو کر اپنے گھر میں بیٹھ جاتا۔ عبدالعزیز بن ولید نے کہا کہ خدا کی قسم آپ کی موجودگی میں کسی اور کو میں خلافت کا مستحق نہیں سمجھتا۔

مسلمانوں میں انتہا پسند خوارج کا ایک طبقہ پیدا ہو گیا تھا۔ وہ حضرت علی کے زمانہ سے ہر حکمراں کے خلاف جنگ چھیڑے رہتا تھا۔ مگر جب عمر بن عبدالعزیز خلیفہ ہوئے تو خوارج نے حکومت سے لڑائی ختم کر دی۔ انھوں نے کہا کہ ہمارے لیے جائز نہیں کہ ہم ایسے صالح آدمی سے جنگ کریں (ما ینبغی لنا اَن نُقاتِلَ ھٰذا الرجل)

عمر بن عبدالعزیز ابتدا سے ایک حق پرست اور بااصول آدمی تھے۔ خلافت سے پہلے وہ مدینہ کے امیر تھے۔ ان کو حجاج بن یوسف کے ظلم کا حال معلوم ہوا تو انھوں نے اس کی شکایت لکھ کر خلیفہ کے نام روانہ کی۔ مگر حجاج خلیفہ کے ذہن پر چھایا ہوا تھا۔ چنانچہ حجاج کی معزولی تو نہیں ہوئی۔ البتہ اس شکایت کی بنا پر خود عمر بن عبدالعزیز امارت مدینہ سے معزول کر دیئے گئے۔ یہ واقعہ ۹۳ ھ کا ہے۔

خراسان کے عامل جراح بن عبداللہ نے حضرت عمر بن عبدالعزیز کو لکھا کہ اہل خراسان بہت ناہموار لوگ ہیں، وہ تلوار کے بغیر سیدھے نہیں ہوں گے۔ اس لیے ان کے خلاف تلوار کے استعمال کی اجازت دی جائے۔ حضرت عمر بن عبدالعزیز نے جواب میں لکھا کہ تم جھوٹ کہتے ہو کہ اہل خراسان تلوار کے بغیر درست نہ ہوں گے۔ انصاف کرنا اور حق دار کو اس کا حق پہنچانا وہ چیزیں ہیں جو ہر ایک کو درست کر دیتی ہیں۔ اس لیے تم ان کے درمیان انھیں دونوں چیزوں کی اشاعت کرو۔

وقت کے تمام علماء نے آپ کے غیر معمولی علم کی گواہی دی ہے۔ مجاہد کا قول ہے کہ ہم عمر بن عبدالعزیز کے پاس اس خیال سے آئے کہ وہ ہم سے کچھ سیکھیں گے، مگر ان کے پاس آنے کے بعد ہمیں خود ان سے سیکھنا پڑا ـــــــ اس سے مراد کتابی علم نہیں، بلکہ وہ علم ہے جو

ہیں، اور اگر اتفاق سے دوسری قوم کا آدمی جیت جائے تو غم سے نڈھال ہو جاتے ہیں۔

یہ صحت مند ذہنیت نہیں، یہ مریضانہ ذہنیت ہے۔ جن لوگوں کا یہ مزاج ہو وہ کبھی کوئی اعلیٰ کامیابی حاصل نہیں کر سکتے۔ ان کے اندر قومی خودغرضی تو خوب ترقی کرے گی، مگر ان کے درمیان سائنٹفک مزاج کبھی ترقی نہیں کر سکتا۔ وہ مزاج جس کا ایک نمونہ موجودہ زمانہ میں جاپان نے پیش کیا ہے۔ یعنی یہ کہ آدمی قوم پسند یا فرقہ پسند نہ ہو بلکہ وہ معیار پسند ہو۔ جن لوگوں کے اندر یہ صفت ہو، وہ جب کوئی کام کرتے ہیں تو ان کی ساری توجہ معیار (Quality) پر ہوتی ہے۔ وہ اپنا کام اس طرح کرتے ہیں کہ اس کے بارے میں وہ اعلیٰ معیار سے کم تر کسی چیز پر راضی نہیں ہوتے۔

جاپانیوں کی یہی خصوصیت ہے جس کی بنا پر ان کے لیے یہ ممکن ہوا کہ وہ اپنی مصنوعات کو نقص بدرجہ صفر (Zero-defect) کے درجہ تک پہونچا سکیں۔ اور اپنے بڑھے ہوئے معیار کی بنا پر ساری دنیا کی مارکیٹ پر قبضہ کر لیں۔

اسرائیل کے قیام سے پہلے کی بات ہے، ایک مسلم پہلوان اور ایک یہودی پہلوان میں کُشتی کا مقابلہ ہوا۔ اس مقابلہ میں مسلمان کامیاب رہا۔ اس نے یہودی پہلوان کو منٹوں کے اندر گرا دیا۔ بظاہر یہودی پہلوان کے لیے یہ بڑی ذلت کی بات تھی۔ مگر اس نے فوراً اٹھ کر مسلم پہلوان کو گلے سے لگا لیا۔ اس نے کہا: میں تمہاری ذات کی نہیں بلکہ تمہارے فن کی قدر کرتا ہوں۔ تم نے جس فن کاری کے ساتھ مجھے گرایا ہے وہ اتنا اعلیٰ ہے کہ میں نے اس کا تصور بھی نہیں کیا تھا۔

کسی قوم میں اسپورٹسمین اسپرٹ کا ہونا یا نہ ہونا کوئی جزئی بات نہیں۔ اس کا تعلق اس قوم کے پورے کردار سے ہے۔ اس کا ظہور زندگی کے تمام معاملات میں ہوتا ہے۔ ایک نوعیت کا ذہن آدمی کو اپنے حریف سے صرف نفرت کرنا سکھاتا ہے۔ حریف کی خوبیاں بھی اس کو برائی کی صورت میں نظر آتی ہیں۔ یہ چیز اس کو ہر اعتبار سے پست کردار بنا دیتی ہے۔ اس کے برعکس دوسرا مزاج آدمی کو معیار پسند بناتا ہے اس سے آگے بڑھنے کا جذبہ پیدا ہوتا ہے۔ اس کے اندر ایک ایسا انسان ابھرتا ہے جس کے لیے دشمن کا عمل بھی مفید سبق حاصل کرنے کا ذریعہ بن جائے۔

سب سے بڑی بھول

ڈِک شان (Dick Shawn) ایک امریکی ایکٹر تھا۔ وہ فلم میں اور اسٹیج پر ہنسانے کا کردار ادا کرتا تھا۔ ۱۷ اپریل ۱۹۸۷ کی رات کو وہ کیلی فورنیا کے مقام لاجولا (La Jolla) میں ایک تھیٹر ہال کے اندر ایکٹنگ کر رہا تھا اور اپنی تفریحی باتوں سے لوگوں کو ہنسا رہا تھا۔ ہال کے اندر چھ سو تماشائی بیٹھے ہوئے اس کی تفریحی باتوں سے لطف لے رہے تھے۔ اس کی ایکٹنگ جاری تھی کہ اچانک وہ اسٹیج پر منھ کے بل گر پڑا۔ لوگوں نے سمجھا کہ یہ کوئی مذاق ہے جو اس نے اپنی ایکٹنگ کے جز کے طور پر کیا ہے :

People thought it was a joke, part of the act.

ایکٹر اسی حال میں چند منٹ تک فرش پر پڑا رہا۔ یہاں تک کہ اس کے لڑکے ایڈم (Adam) کو شبہ ہوا۔ اس نے ایک ڈاکٹر کو بلایا۔ ڈاکٹر نے آکر دیکھا اور فوراً اسپتال لے جانے کا مشورہ دیا۔ ایمبولنس کے ذریعہ اس کو اسپتال پہنچایا گیا۔ اسپتال کے ڈاکٹروں نے جانچ کرنے کے بعد اعلان کیا کہ ڈِک شان کا انتقال ہو چکا ہے۔ انتقال کا سبب غالباً دل کا دورہ (Heart attack) تھا۔ انتقال کے وقت اس کی عمر ۵۷ سال تھی (ٹائمس آف انڈیا ۲۰ اپریل ۱۹۸۷)

اس دنیا میں کوئی شخص روتے ہوئے مرجاتا ہے اور کوئی شخص ہنستے ہوئے۔ کسی پر اس کی موت بدحالی میں آجاتی ہے اور کسی پر خوش حالی میں۔ کوئی خاک پر بیٹھا ہوا اس دنیا سے چلا جاتا ہے اور کوئی تخت حکومت پر۔ موت ایک ایسا انجام ہے جو ہر ایک پر آتا ہے خواہ وہ ایک حالت میں ہو یا دوسری حالت میں۔

مگر موت ہی وہ سب سے بڑی حقیقت ہے جس کو انسان سب سے زیادہ بھولا ہوا ہے یہاں رونے والا اور ہنسنے والا دونوں ایک ہی حال میں مبتلا ہیں۔ وہ صرف اپنے آج کو جانتے ہیں، وہ اپنے کل کو نہیں جانتے۔ اگر وہ اپنے کل کو جان لیں تو ہنسنے والے کا حال بھی وہی ہو جائے جو رونے والے کا حال نظر آرہا ہے۔

یہ سب سے بڑی بھول ہے جس میں آج کا انسان مبتلا ہے۔

الرسالہ جنوری ۱۹۸۸

دنیا اور آخرت

موجودہ دنیا میں حق کے پاس دلیل ہے مگر طاقت نہیں۔ آخرت کی دنیا میں حق کے پاس دلیل بھی ہوگی اور طاقت بھی ——— یہی ایک لفظ میں موجودہ دنیا اور آخرت کی دنیا کا خلاصہ ہے۔

اسی سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ وہ کون لوگ ہیں جن کو آخرت کی دنیا میں عزت اور ترقی کا مقام دیا جائے گا۔ یہ وہ لوگ ہیں جو حق کے سامنے اس وقت جھک گئے جب کہ وہ حق کے سامنے جھکنے کے لیے مجبور نہ تھے۔ جنھوں نے حق کا اعتراف اس وقت کیا جب کہ وہ اس کا انکار بھی کر سکتے تھے۔

موجودہ دنیا میں انسان کی سب سے بڑی خوبی اعتراف ہے۔ اپنے سے باہر جو واقعہ موجود ہے، اس کا اعتراف کسی تحفظ ذہنی کے بغیر کرنا، یہی کمال انسانیت ہے۔ یہی وہ بنیادی انسانی صفت ہے جس سے دوسری تمام صفاتِ انسانی پیدا ہوتی ہیں۔ جس آدمی کے اندر جتنا زیادہ اعتراف کا مادہ ہوگا، اتنا ہی زیادہ اس کی انسانیت ترقی کرے گی۔ اور کسی شخص کے اندر اعتراف کے معاملہ میں جتنی کمی ہوگی اتنا ہی وہ گراوٹ کا شکار ہوتا چلا جائے گا۔

اس اعتراف کا اظہار دو سطحوں پر ہوتا ہے۔ خدائی سطح پر، اور علمی حقائق کی سطح پر۔ مومن کے جذبہ اعتراف کا اظہار ذات خداوندی کی سطح پر ہوتا ہے جو نہ صرف سب سے بڑی حقیقت ہے بلکہ تمام حقیقتیں اسی کی مخلوق ہیں۔ غیر مومن کے جذبہ اعتراف کا اظہار ان حقائق کی سطح پر ہوتا ہے جن کا ادراک کرنے کے لیے صرف عقلی قوتوں کا اعتراف کافی ہو۔

سچا مومن خدا پرست ہوتا ہے اور سچا انسان حقیقت پرست۔ جو لوگ واقعی معنوں میں حقیقت پرست اور حقیقت پسند ہوں وہی لوگ اس امتحان کی دنیا میں ایمان (بالفاظِ دیگر اعتراف صداقت) کی توفیق پاتے ہیں۔ جو لوگ اس ابتدائی انسانی صفت سے خالی ہوں وہ گویا حیوان ہیں جن کے اوپر انسان کا لباس اوڑھا دیا گیا ہے۔ وہ دنیا میں باعتبار حقیقت اندھے ہیں اور آخرت میں وہ باعتبار حقیقت بھی اندھے ہوں گے اور باعتبار واقعہ بھی۔

اجنبی دین

عن ابی ھریرۃ قال قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم۔ بدأ الاسلام غریباً وسیعود کما بدأ فطوبیٰ للغرباء (رواہ مسلم)

حضرت ابوہریرہؓ کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ اسلام اجنبی حالت میں شروع ہوا، اور وہ پھر ویسا ہی ہو جائے گا جیسا کہ شروع ہوا تھا۔ تو ایسے اجنبیوں کو مبارکی ہو۔

وعن عمرو بن عوف قال قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم۔ إنّ الدین بدأ غریباً وسیعود کما بدأ فطوبیٰ للغرباء۔ وھم الذین یُصلحون ما افسدَ الناسُ من بعدی من سُنّتی (رواہ الترمذی)

حضرت عمرو بن عوف کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ دین شروع ہوا تو وہ اجنبی تھا، اور وہ پھر ویسا ہی ہو جائے گا جیسا کہ شروع میں تھا۔ تو اجنبیوں کو مبارکی ہو۔ یہی لوگ ہیں جو اس بگاڑ کی اصلاح کریں گے جو میرے بعد میری سنت میں لوگ کریں گے۔

آدمی جب کوئی چیز کھاتا ہے تو اس کو اس کے مزہ کا احساس ہوتا ہے ——— نمکین، میٹھا کھٹا، کڑوا، وغیرہ۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ آدمی کی زبان میں مختلف قسم کے ذائقہ خانے (Taste buds) ہیں۔ کھانے کے دوران جب کوئی چیز ان ذائقہ خانوں کو چھوتی ہے تو نازک تاروں کے ذریعہ ان کی خبر دماغ تک پہنچتی ہے۔ اس طرح آدمی جان لیتا ہے کہ وہ جو چیز کھا رہا ہے اس کا ذائقہ کیا ہے۔ زبان کے یہ ذائقہ خانے اگر اپنی فطری حالت میں ہوں تو ایسے آدمی کو چیزوں کا صحیح ذائقہ (True taste) ملے گا اور اگر کوئی شخص اپنے ذائقہ خانوں کو ان کی اصلی حالت میں محفوظ نہ رکھ سکے تو اس کو غلط ذائقہ (False taste) ملنے لگے گا۔

بگاڑ کے زمانہ میں ایسا ہوتا ہے کہ خدا اور رسول والا دین گم ہو جاتا ہے اور دین کی دوسری دوسری شکلیں رائج ہو جاتی ہیں۔ مثلاً قومی دین، برکت والا دین، رسم ورواج والا دین، آبائی فخر والا دین، لوگ دین کی انھیں خودساختہ شکلوں سے مانوس ہوتے ہیں۔ چنانچہ وہ خدا اور رسول والے دین کو اجنبی سمجھ کر اس کو ماننے سے انکار کر دیتے ہیں۔

شیطان کی پیروی

روایات میں آتا ہے کہ ایک بار حضرت عمر فاروق رضی مدینہ کی مسجد نبوی میں آئے تو دیکھا کہ صحابہ وہاں بیٹھے ہوئے ہیں اور یہ ذکر کر رہے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی تمام بیویوں کو طلاق دے دی ہے۔ اگرچہ اس بات کو بیان کرنے والے صحابہ کرام تھے اور یہ بات مسجد نبوی جیسے مقدس مقام پر بیان ہو رہی تھی، مگر حضرت عمرؓ نے اس سے انکار کیا کہ وہ محض سُن کر اُس کو مان لیں۔ انھوں نے کہا کہ میں اس کے بارہ میں اس وقت تک کوئی رائے نہیں دے سکتا جب تک خود رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم سے براہِ راست دریافت نہ کر لوں۔

چنانچہ وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی رہائش گاہ پر آئے اور دروازہ پر کھڑے ہو کر آواز دی۔ آپ سے اجازت لے کر اندر داخل ہوئے اور مذکورہ خبر بیان کر کے اس کی اصل حقیقت دریافت کی۔ آپ نے فرمایا کہ نہیں، میں نے طلاق نہیں دی ہے۔ حضرت عمر اس کے بعد دوبارہ مسجد نبوی میں آئے اور اس کے دروازے پر کھڑے ہو کر بلند آواز سے کہا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی عورتوں کو طلاق نہیں دی ہے۔ اس پر قرآن میں یہ آیت اتری :

وَإِذَا جَاءَهُمْ أَمْرٌ مِّنَ الْأَمْنِ أَوِ الْخَوْفِ أَذَاعُوا بِهِ ۖ وَلَوْ رَدُّوهُ إِلَى الرَّسُولِ وَإِلَىٰ أُولِي الْأَمْرِ مِنْهُمْ لَعَلِمَهُ الَّذِينَ يَسْتَنبِطُونَهُ مِنْهُمْ ۗ وَلَوْلَا فَضْلُ اللَّهِ عَلَيْكُمْ وَرَحْمَتُهُ لَاتَّبَعْتُمُ الشَّيْطَانَ إِلَّا قَلِيلًا

(النساء ۸۳)

اور جب ان کو کوئی بات امن یا خوف کی پہنچتی ہے تو وہ اس کو پھیلا دیتے ہیں۔ اور اگر وہ اس کو رسول تک یا اپنے ذمہ دار اصحاب تک پہنچاتے تو ان میں سے جو لوگ تحقیق کرنے والے ہیں وہ اس کی حقیقت کو جان لیتے۔ اور اگر تم پر اللہ کا فضل اور اس کی رحمت نہ ہوتی تو تھوڑے لوگوں کے سوا تم سب شیطان کے پیچھے لگ جاتے۔

آج کل فساد یا فرقہ وارانہ خبروں کے معاملہ میں تمام مسلمان اس اسلامی تعلیم کی خلاف ورزی کر رہے ہیں۔ میری معلومات کے مطابق شاید چند مسلمان بھی اس ملک میں ایسے نہیں ہیں جو ہندو تعصب یا فرقہ وارانہ فساد کی کوئی خبر سنیں تو اس کی پوری طرح تحقیق کریں اور اس کے

تمام متعلقہ پہلوؤں کی جانچ کے بعد اپنی رائے قائم کریں۔ ہر ایک کا یہ حال ہو رہا ہے کہ ہندو یا حکومتی شعبوں کے بارے میں جو کچھ سنا اس کو مان لیا اور فوراً ہی اس کو پھیلانا شروع کر دیا۔

آج کل کسی بات کو پھیلانے کا سب سے بڑا ذریعہ اخبارات ہیں۔ اس اعتبار سے مسلمانوں کے اردو اخبارات کو دیکھئے تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وہ اسی ممنوعہ عمل کی ایجنسی بن گیے ہیں۔ مسلمانوں نے آج کل بے شمار اخبارات نکال رکھے ہیں، ان اخبارات کا مشترک کاروبار یہی ہے کہ ہندو۔ مسلم مسائل سے متعلق کوئی بات پا جائیں تو فوراً اس کو بڑھا چڑھا کر چھاپیں اور اس کو زیادہ سے زیادہ سنسنی خیز بنا کر لوگوں کے سامنے پیش کریں۔

صحابہ کرام سے تو اس قسم کی ایک معمولی لغزش محض وقتی طور پر ہو گئی تھی۔ اور تنبیہ کے بعد وہ فوراً پلٹ آئے۔ مگر اس ملک کے مسلمان نصف صدی سے اسی قسم کی صحافت میں گم ہیں۔ صحافت کی اس قسم کو موجودہ زمانہ میں زرد صحافت (ایلو جرنلزم) کہا جاتا ہے۔ مسلمانوں کے ایک طبقہ نے اس زرد صحافت کو نہایت نفع بخش کاروبار سمجھ کر اختیار کر رکھا ہے۔ مگر انھیں جاننا چاہیے کہ یہ عین وہی جرم ہے جس کو قرآن کی مذکورہ بالا آیت میں اتباع شیطان کہا گیا ہے۔

مذکورہ آیت میں کہا گیا ہے کہ جب کوئی اہم خبر ملے تو اس کو رسول کی طرف اور اصحابِ امر کی طرف لوٹاؤ۔ اس سے دو باتیں معلوم ہوتی ہیں۔

ایک یہ کہ ایسی ہر خبر کو ہمیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے لائے ہوئے دین اور آپ کی چھوڑی ہوئی سنت کی روشنی میں جانچنا چاہیے، اور اسی کی روشنی میں اس کے بارہ میں اپنا رویہ متعین کرنا چاہیے۔ مسلمانوں پر لازم ہے کہ اس طرح کے امور میں وہ سنتِ رسولؐ کی پابندی کریں نہ یہ کہ قومی جذبات جدھر چلنے کا تقاضا کریں اسی طرف تمام لوگ چل پڑیں۔

دوسری چیز اصحاب امر کی طرف رجوع کرنا ہے۔ اس حکم کی تعمیل اسی وقت ہو سکتی ہے جب کہ مسلمانوں کے درمیان "اصحاب امر" کا وجود ہو۔ اس لیے مسلمانوں پر لازم ہے کہ وہ اس کا اہتمام کریں۔ اگر با اختیار اصحاب امر موجود نہ ہوں تو رضا کارانہ بنیاد پر اپنے درمیان اصحاب امر کو وجود میں لائیں اور تمام اہم امور میں اسی اجتماعی ادارہ کے فیصلہ کی پیروی کریں نہ کہ اپنی انفرادی رائے کی۔

جن اور عملیات

عوام میں یہ عقیدہ پھیلا ہوا ہے کہ جنات انسانوں کے اوپر قابو پا لیتے ہیں اور انھیں پریشان کرتے ہیں۔ یہ عقیدہ بالکل لغو ہے۔ قرآن و حدیث میں اس کے لیے کوئی بنیاد موجود نہیں۔

قرآن سے ثابت ہے کہ شیطان جنوں میں سے ایک جن ہے (فسجدوا الا ابلیس کان من الجن، الکہف ۵۰) اور شیطان کے بارہ میں واضح طور پر بتایا گیا ہے کہ اس کو انسانوں کے اوپر کوئی عملی اختیار حاصل نہیں:

ان عبادی لیس لک علیہم سلطان الا من اتبعک من الغاوین (الحجر ۴۲) — جو میرے بندے ہیں، ان پر تیرا کوئی زور نہیں مگر وہ جو تیری راہ چلا بہکے ہوئے لوگوں میں سے۔

یہی بات قرآن میں دوسرے مقام پر ان الفاظ میں ہے کہ شیطان کو ان لوگوں پر کوئی اختیار نہیں جو ایمان والے ہیں اور اللہ پر بھروسہ رکھتے ہیں۔ شیطان کا اختیار صرف ان لوگوں پر ہے جو اس کو اپنا دوست بنائیں (انہ لیس لہ سلطان علی الذین آمنوا وعلی ربہم یتوکلون۔ انما سلطانہ علی الذین یتولونہ، النحل)

غیر اہل ایمان پر بھی شیطان کو عملی یا جسمانی اعتبار سے کوئی اختیار نہیں۔ ان پر بھی اس کو صرف بہکانے کا اختیار ہے۔ جو لوگ معرفت حق سے خالی ہوں اور جو توہم پرستی میں مبتلا ہوں ان کو بہکانے میں شیطان کامیاب ہو جاتا ہے۔ یہی اس کی آخری حد ہے۔ چنانچہ قیامت کے دن شیطان اپنے پیرؤوں سے کہے گا کہ مجھے تمہارے اوپر کوئی اختیار حاصل نہ تھا۔ الا یہ کہ میں نے تمہیں پکارا تو تم نے میری بات سنی (وما کان لی علیکم من سلطان الا ان دعوتکم فاستجبتم لی، ابراہیم)

سورہ ابراہیم کی مذکورہ آیت (۲۲) کی تشریح علامہ ابو البرکات عبداللہ بن احمد بن محمود النسفی نے ان الفاظ میں کی ہے:

(وما کان لی علیکم من سلطان) من تسلط واقتدار (الا ان دعوتکم) لکنی دعوتکم الی الضلالۃ بوسوستی وتزئینی — "تمہارے اوپر مجھے سلطان نہ تھا" کا مطلب یہ ہے کہ تمہارے اوپر مجھے کوئی تسلط اور اقتدار حاصل نہ تھا۔ "الا یہ کہ میں نے تمہیں پکارا"۔ یعنی میں نے

(فاستجبتم لی، فاسرعتم اجابتی) تم کو گمراہی کی طرف وسوسہ اور تزئین کے ذریعہ
التفسیر النسفی، الجزء الثانی، صفحہ ۲۶۰ بلایا۔ " تو تم نے میری پکار پر لبیک کہا " یعنی تم میر
پکار پر دوڑ پڑے۔

شیطان کیا ہے، وہ ایک جن ہے۔ بلکہ وہ جنوں کا سردار ہے۔ قرآن کے مطابق اس کو انسان کے اوپر کوئی عملی یا جسمانی اختیار حاصل نہیں۔ جب قرآن کا بیان یہ ہے تو ایسے تمام خیالات باطل اور لغو ہیں جن میں یہ فرض کیا گیا ہو کہ شیطان (یا جنات) آدمی کے اوپر آتے ہیں اور وہ انسان کو جسمانی طور پر مغلوب کر کے اس کو اپنے قابو میں کر لیتے ہیں۔ شیطان (یا جنات) آدمی کو صرف بہکا سکتے ہیں، اس سے زیادہ کچھ اور کرنے پر وہ قادر نہیں۔

اسی طرح یہ خیال بھی سراسر لغو ہے کہ انسان عملیات کے ذریعہ جنوں کو مسخر کر لیتا ہے اور ان سے بڑے بڑے کام لیتا ہے۔ قرآن وحدیث کے پورے ذخیرہ میں اس قسم کے عقیدہ کے لیے کوئی بنیاد موجود نہیں۔ جنات کی تسخیر کا عقیدہ دراصل یہود کی خرافات ہے۔ یہ یہود سے دوسر قوموں میں بھی آگیا ہے۔ یہود نے حضرت سلیمان کے معاملہ کی غلط تشریح کر کے جن کی تسخیر اور عملیات کا فن ایجاد کیا اور اس کو بے بنیاد طور پر مذہبی حیثیت دیدی۔

حضرت سلیمان علیہ السلام بنی اسرائیل کے مشہور پیغمبر اور بادشاہ ہیں۔ ان کا زمانہ دسویں قبل مسیح ہے۔ انھوں نے تقریباً چالیس سال تک حکومت کی۔ ان کا پایۂ تخت یروشلم تھا۔ شام و کے علاوہ آپ کی سلطنت کے حدود ایک طرف فرات تک اور دوسری طرف مصر کی سرحد تک پھیلے ہوئے تھے۔ حضرت داؤد اور حضرت سلیمان کی سلطنت (۱۰۰۰ - ۹۳۰ ق م) کا نقشہ انسائیکلوپیڈیا برٹانیکا (۱۹۸۴) جلد ۱۷ صفحہ ۹۴۳ پر دیکھا جا سکتا ہے۔

قرآن کے بیان کے مطابق حضرت سلیمانؑ کو غیر معمولی طاقتیں حاصل تھیں۔ ہوا ان کے تابع تھی۔ جنات ان کے لیے مسخر کر دیئے گیے تھے۔ وہ جانوروں کی بولیاں سمجھتے تھے۔ وہ غیر معمولی واقعات ظہور میں لانے پر قادر تھے۔

حضرت سلیمان علیہ السلام کو یہ چیزیں پیغمبر کی حیثیت سے دی گئی تھیں۔ مگر یہودیوں میں ایک طبقہ پیدا ہوا جو یہ کہتا تھا کہ سلیمان جو غیر معمولی کام کرتے ہیں وہ سب جادو کے زور پر کرتے ہیں

یہ ذہن یہودیوں میں اتنا بڑھاکہ وہ حضرت سلیمان کی پیغمبری کے منکر ہوگیے۔ وہ کہنے لگے کہ سلیمان جادوگر تھے نہ کہ پیغمبر۔ چنانچہ موجودہ بائبل میں حضرت سلیمان کے بارہ میں جو باب ہے وہ نہ صرف یہ کہ آپ کو پیغمبر کی حیثیت سے پیش نہیں کرتا بلکہ اس کو پڑھ کر آپ کے کردار کے بارہ میں بھی کوئی اونچی تصویر نہیں بنتی :

لما ذکر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فیما نزل علیہ من اللہ سلیمان بن داوٗد وعدّہ فیمن عدّ من المرسلین. قال من کان بالمدینۃ من الیہود الا تعجبون من محمد یزعم ان ابن داوٗد کان نبیاً واللہ ما کان الا ساحراً

(تفسیر ابن کثیر، الجزء الاول، صفحہ ۱۳۶)

جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کا ذکر کیا جو سلیمان بن داوٗد کے بارہ میں آپ پر اترا تھا اور ان کو پیغمبروں میں سے شمار کیا تو مدینہ کے یہودیوں نے کہا کہ کیا تم محمد پر تعجب نہیں کرتے۔ ان کا گمان ہے کہ ابن داوٗد نبی تھے۔ خدا کی قسم وہ تو صرف ایک جادوگر تھے۔

یہود کی تاریخ بتاتی ہے کہ قدیم زمانہ میں انھوں نے جادو اور عملیات کا زبردست کاروبار پھیلا رکھا تھا۔ جیوش انسائیکلوپیڈیا میں اس کا تفصیلی ذکر ہے، اس سلسلہ میں مقالہ نگار نے یہ الفاظ لکھے ہیں :

> Adultry and sorcery have destroyed everything, the Majesty of God departed from Israel. Exorcism also flourished. The Greco-Roman world regarded the Jews as a race of Magicians.
> *Jewish Encyclopedia,* Vol. VII, p. 255.

بدکاری اور جادو نے ہر چیز کو برباد کر دیا تھا۔ خدا کی عظمت اسرائیل سے رخصت ہوگئی تھی۔ جھاڑ پھونک بھی ان کے درمیان کثرت سے پھیلا ہوا تھا۔ یونانی اور رومی دنیا یہود کو جادوگروں کی ایک نسل سمجھنے لگی تھی۔

جادو اور عملیات کے اس کاروبار کو یقینی ثابت کرنے کے لیے انھیں کوئی حوالہ درکار تھا اور یہ حوالہ انھوں نے حضرت سلیمان کی زندگی میں دریافت کرلیا۔ حضرت سلیمان کے حیرت انگیز واقعات لوگوں کو معلوم تھے۔ یہود نے کہا کہ سلیمان یہ تمام واقعات جادوگری کے زور پر کرتے تھے نہ کہ پیغمبری کے زور پر۔

بالفاظ دیگر، یہود نے حضرت سلیمان کو پیغمبروں کی صف سے نکال کر عام انسانوں کی صف میں کھڑا کر دیا۔ اگر وہ انھیں پیغمبر کہتے تو ان کے غیر معمولی واقعات معجزہ قرار پاتے اور معجزہ صرف پیغمبر سے صادر ہوتا ہے۔ عام انسان معجزہ دکھانے پر قادر نہیں۔ مگر جب انھوں نے حضرت سلیمان کو ایک عام انسان قرار دیا۔ اور ان کے غیر معمولی واقعات کو جادو بتایا تو ان واقعات کا ظاہر کرنا عام آدمی کے بس کی چیز بن گیا۔ کیوں کہ جادو کے کرشمے عام انسان دکھاتا ہے، اس کے لیے پیغمبر ہونے کی ضرورت نہیں۔

قرآن سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت سلیمان علیہ السلام کے بعد کچھ مفاد پرست یہودیوں نے یہ کیا کہ جھوٹے قصے کہانیاں بنا کر انھوں نے مشہور کیا کہ حضرت سلیمان جو غیر معمولی کارنامے کرتے تھے وہ کوئی پیغمبری کا معاملہ نہ تھا، وہ جادو کا معاملہ تھا۔ پیغمبر کا معجزہ صرف پیغمبر کے لیے خاص ہوتا ہے۔ وہ ایک استثنائی واقعہ ہوتا ہے جس کو دوسرا عام آدمی دہرا نہیں سکتا۔ اس لیے انھوں نے آپ کے کارناموں کو معجزہ کے بجائے جادو بتایا تاکہ اس کے نام پر اپنا عملیاتی کاروبار جاری کر سکیں۔ قرآن میں ارشاد ہوا ہے:

واتبعوا ما تتلوا الشیاطین علیٰ ملک سلیمان وما کفر سلیمان ولکن الشیاطین کفروا یعلمون الناس السحر

(البقرہ ۱۰۲)

(یہود کے ایک گروہ نے آسمانی کتاب پس پشت ڈال دی) وہ اس چیز کے پیرو بن گیے جو شیاطین سلیمان کی بادشاہت پر پڑھتے تھے۔ اور سلیمان نے کفر نہیں کیا بلکہ شیاطین نے کفر کیا۔ وہ لوگوں کو سحر کی تعلیم دیتے تھے۔

اس آیت میں کفر سے مراد سحر ہے جیسا کہ آیت کا اگلا ٹکڑا واضح کر رہا ہے۔ سحر کو کفر اس کی شناعت کی بنیاد پر کہہ دیا۔ جیسے کوئی نوجوان جھوٹ بولے تو کوئی شخص کہے: یہ تم نے کیا شیطانی کی، ایسی شیطانی تو تمہارے باپ نے کبھی نہیں کی تھی۔ حضرت سلیمان کی وفات کے بعد یہودیوں نے آپ کی طرف منسوب کر کے سحر اور عملیات کا کاروبار شروع کر دیا تھا۔ اسی کی بابت فرمایا گیا کہ تم یہ جو سلیمان کی طرف منسوب کر کے کر رہے ہو یہ صرف تمہاری سرکشی ہے ورنہ سلیمان کا تعلق اس قسم کے جادو اور عملیات سے ہرگز نہ تھا۔